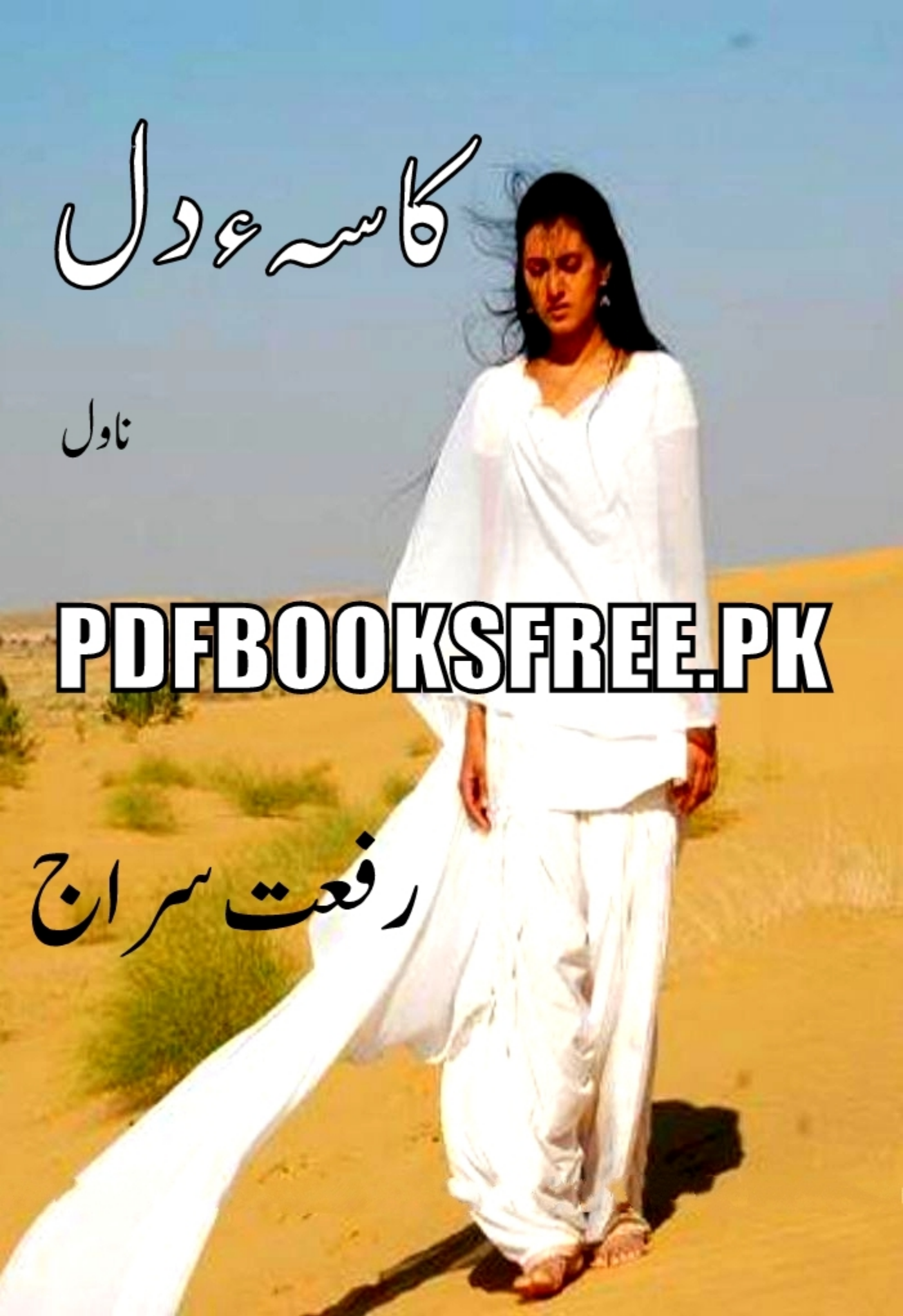


کاسہ و دل

ناول

PDFBOOKSFREE.PK

رفت سراج



کاسہء دل

ناول

از

رفعت سراج

جس طرح اندھوں میں کانا، راجا یا سردار کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل اسی طرح اس محلے میں مولوی صاحب کی حیثیت تھی۔

مٹھی بھر داڑھی، پنج وقتہ نمازی اور صحاح ستہ کے نام ازبر ہونے کی بنا پر انہیں مولوی صاحب کے ٹائٹل یا خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ وہ امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور انہیں محلے کے محکمہ قضا میں چیف جسٹس کی معتبر نشست بھی حاصل تھی۔ یعنی مولوی صاحب کی مصروفیات اس ملک کے کسی بھی بڑے آدمی سے کسی طور کم نہ تھیں۔

شیخ معین الدین کے مکان میں انسانوں کا ایک انبوہ موجود تھا اور شور میں کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی سوا اس کے کہ مولوی صاحب کب آئیں گے؟ باہر کھڑے ہو متعدد افراد بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے از حد نیچیں تھے اور یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ خصوصی عدالت کا وقت کیا ہے؟

پتا نہیں مولوی صاحب کہاں رہ گئے۔ وہ عصر کے فرض پڑھا کر نکلے تھے پھر جانے کس طرف چلے گئے، اب مغرب کی نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ کسی نمازی نے مقدور بھر معلومات تشویش کے لفافے میں بند کر کے آگے بڑھائیں۔

اے بیٹی خدا کے لیے روؤ مت۔ مولوی صاحب آتے ہوں گے، وہی طے کریں گے کہ تمہارے لیے کیا کیا جا؟ اے ہے، کیا اندھیر ہے، ظالم لوگ کنواری لڑکی کو دھکے دے کر یوں

باہر نکال دیتے ہیں۔ ایمان تو دلوں سے اٹھ گیا ہے۔ خوف خدا بھی نہیں رہا۔ کسی بوڑھی عورت نے حالات حاضرہ کی تصویر کشی کرنا ضروری خیال کیا۔

اسی وقت اذان مغرب شروع ہوئی۔ نمازیوں نے مسجد کی سمت قدم بڑھا دیے۔ مسجد میں مولوی صاحب پہنچ چکے تھے۔ لوگوں نے انہیں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ نماز ختم ہونے تک تو یہ واقعہ نمازیوں کے سینوں میں بند رہا لیکن نماز تمام ہونے پر لوگوں نے مولوی صاحب کو گھیر کر آج کی تازہ خبر سنا دی۔

شیخ معین الدین کی بیٹھک میں بیٹھے حد درجہ باحیا مولوی صاحب محترمہ سے ضروری سوال کر رہے تھے۔ محترمہ بیٹھک کے دروازے کی اوٹ میں؟؟؟؟ اور خواتین کے ہمراہ تشریف فرما تھیں۔

بی بی یہ درست، مان لیا اکثر سوتیلی مائیں اسی رویے کے سبب بدنام ہو جاتی ہیں۔ لیکن تم نے بھی گھر چھوڑ کر سخت غیر عاقلانہ فیصلہ کیا ہے۔ وہ بولے۔

مولوی صاحب گھر میں نے نہیں چھوڑا۔ مجھے دھکے مار کر نکالا گیا ہے۔ آواز پر سسکیاں غالب تھیں۔ میری سوتیلی ماں کا سلوک تو میرے والد کی زندگی ہی میں اچھا نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی خدمت سے ان کا دل جیتنے کی بہت کوشش کی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد تو انہوں نے میرا جینا دو بھر کر دیا اور آج صبح ہی سے وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ دوپہر کو انہوں نے مجھے مار کر اور یہ کہہ کر نکال دیا کہ آئندہ اپنی منحوس صورت انہیں نہ دکھاؤں۔ ہچکیوں

اور سکیوں کے درمیان بتایا گیا۔

آہ۔ ہا۔ کئی ٹھنڈی آہوں نے پچھلے کی گئی پوری کرنے کی کوشش کی۔

لیکن بی بی تمہیں انجان راستوں پر چلنے کے بجائے کسی رشتے دار کے ہاں چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ فطری سادگی و شائستگی سے گویا ہو۔

میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ پاکستان بننے کے بعد تمام خاندان میں سے صرف میرے والد نے پاکستان ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چار بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ میرے والد بتایا کرتے تھے کہ ان کے تمام خوشحال رشتے داروں نے آزادی سے زیادہ اپنی جائیدادوں اور چلتے کاروبار کو اہم سمجھا تھا۔ میرا اس ملک میں کوئی رشتہ دار نہیں۔

یہ سن کر رقیق القلب خواتین کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

بات یہ ہے بی بی کہ آج کا زمانہ بہت خطرناک ہے۔ لوگ کیا ہوتے ہیں مگر کیا بن کر ملتے ہیں۔ اب یہ بتاؤ ہم اہل محلہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ اگر تم پسند کرو تو ہمیں سوتیلی ماں سے ملواؤ۔ ہم انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے۔

خدا کے لئے مجھے اس عذاب میں دوبارہ ڈالنے کا سوچے گا بھی نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ میں سمندر میں کود کر جان دے دوں۔ وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

معاذ اللہ مولوی صاحب کا معصوم دل کانپ کر رہ گیا۔ اس مہینہ اعلان خودکشی پر چند لمحے انہیں اپنا دل سنبھالنے میں لگ گئے۔

تو پھر بتاؤ تم نے اس کچی بستی میں پناہ لینے کا ارادہ کیا سوچ کر کیا؟ ہم غریب لوگ ہیں یہاں کوٹھیاں ہمارے پاس نہیں کہ ہمیں گھریلو ملازمین کی ضرورت پیش آ۔ جیسا کہ شیخ صاحب نے بتایا کہ تم گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرنے کی خواہش مند ہو۔ یہاں تو ان بیچاروں کو اپنے پیٹ کی فکر سے ہی فراغت نہیں۔ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مولانا صاحب لڑکی کی ٹھہری ہوئی آواز آئی۔ اگر اس محلے میں کوئی ایسا گھر ہے جس میں بوڑھے میاں بیوی رہتے ہوں تو میں ان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کروں گی۔

دو بہوؤں کی ساس کو یکدم اپنا بڑھاپا اور اولاد کی بے توجہی یاد آ گئی جو اسے چھوڑ کر جا چکی تھیں اس نے جھٹ خود کو پیش کر دیا۔

کچی آبادی کے ان سیدھے سادھے لوگوں کو مزدوریوں اور بیماریوں سے لمحے بھر کی فراغت نہیں تھی۔ انہوں نے جیسے جہالت کے اندھیروں سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے الہتہ پڑھ رہے تھے مگر وہ بھی جبراً نہ انہیں تحقیق کے انداز آتے تھے۔ نا انسانوں کی سمجھ بوجھ تھی۔ ان ہمدرد، نغمہ سار اور محنت کش لوگوں میں صرف ایک مولوی صاحب ہی تھے جو پرائمری اسکول میں سیکر استاد ہونے کے ساتھ ساتھ بستی کی ہمہ صفت اور قابل احترام شخصیت تھے، انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔

بی بی تم اس بوڑھی خاتون کے پاس رہ سکتی ہو لیکن سراسر اپنی ذمہ داری پر۔ اس شہر میں بے سہارا عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی مراکز بھی ہیں۔ اگر تمہارا ارادہ ہو تو غلطی کر دینا، میں تمہاری

بدو کر کے انسانیت کے ناطے، بہت خوشی محسوس کروں گا۔

عدالت پر خواست ہوگئی، اہل محلہ کے لیے اس نووارد لڑکی کا وجود کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہنرمند تھی، ان کے اچھے اچھے کپڑے سی دیا کرتی۔ انتہائی کم قیمت کپڑے استعمال کرنے والوں کے ملبوسات کی ایسی ڈیزائننگ کرتی کہ انہیں بھی اچھا لباس میسر آ جاتا۔ اسکول جانے والے بچے شام کو اس کے پاس پڑھنے چلے جاتے۔ بڑی بی کے اجاڑ گھر میں خوب رونق لگی رہتی۔ خوبصورتی و حسن تو بجا خود روشنی ہوتا ہے۔ اس طعینہ کے گھر کے در و دیوار جگر جگر کرنے لکے تھے اور بوڑھے ناتواں وجود کو آرام بھی میسر آ گیا تھا۔

وہ لڑکی اپنا تعارف پہلی ہی ملاقات میں کرا چکی تھی۔ اب لوگوں کے پاس کھوجنے کو کچھ نہیں رہے گا۔ جب کبھی کوئی خاتون بات کرنا چاہتی تو سوتیلی ماں کا حوالہ خوب تھا۔ عموما محلے کی خواتین اس کی سوتیلی ماں کے ذکر سے گفتگو کا آغاز کرتیں یا پھر ہندوستان میں مقیم اس کے رشتیداروں کے جنموں میں کیڑے ڈالتیں۔ جنہوں نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔

اس کے ہاتھ میں بلا کا ڈانٹہ تھا۔ عام اور سادہ سا کھانا بھی بہت مزیدار محسوس ہوتا تھا۔ اب محلے کی بزرگ خواتین و حضرات کو ایک سوچ مستقل لگی تھی کہ اس بے سہارا لڑکی کا گھر آباد کر دیا جائے۔ انہوں نے اس کے لیے بڑھونڈنا چاہا تو وہ اتنی مصفا اور پاکیزہ نظر آئی کہ اس کے سامنے محلے کا ہر شخص گندا اور جاہل نظر آنے لگا۔ محلے کی خواتین ایسی سکھڑ، سیانی کیساتھ کوئی ظلم یا نا انصافی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بہت بہا تھ پاؤں مارے گئے، آخر کار نظر تھک کر مولوی

صاحب پر آنکھ پڑی، مضبوط کاتھی کے سیاہ دائرہ والے، انکسار و حیا کے سبب گردن جھکا کر چلنے والے۔ جب محلے کے سب سے معمر اور سب سے ناخواندہ شخص کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچی تو وہ نہایت حلیم انداز میں گویا ہو۔

میاں صاحب ان کے لیے خدا کوئی اچھا بندوبست ضرور کرے گا انشاء اللہ۔ مین ان کے لائق نہیں ہوں۔ وہ بہت کم عمر ہیں، پینتیس، اڑتیس سان کے مولوی صاحب نے واضح انکار کر دیا۔ حالانکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ لڑکی کو چنداں اعتراض نہیں ہے مگر کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ مولوی صاحب سے اصرار کر سکتا۔ ناچار لوگ چپ ہو گئے۔

ہر جمعرات کو لوگ کوئی میٹھی چیز پکوا کر مولوی صاحب کے حضور پیش کیا کرتے۔ یہ عمل مولوی صاحب کو پسند نہیں تھا۔ مگر انہیں ناچار سادگی کے مارے عقیدت مندوں کا دل رکھنا ہی پڑ جاتا۔ بڑی بی ہر جمعرات کو گوشت پکاتی تھیں۔ اور مولوی صاحب کو کھانا ضرور بھجواتی تھیں۔ جبکہ مولوی صاحب نے بار بار انہیں اس نیک عمل سے باز رکھنا چاہا۔ مولوی صاحب کے ذمے اس محلے کے در بھی بہت سے کام تھے، کسی کے گھر ختم، نیاز ہے تو مولوی صاحب کی ذمہ داری۔ کسی کے بچے کو نظر لگ جانے کا شبہ ہو تو وہ دوڑا ہوا چلا آیا۔ دم کرانے۔ کسی کے چکر رکھنے کا نام نہیں لے رہے تو پانی پڑھ کر دینا مولوی صاحب کا کام۔

شاید کھانے پینے کی اشیاء انہیں بطور اعزاز پیش کی جاتی تھیں جو انہیں محبوب کرتی تھیں۔ آسودہ نہیں مگر یہ ناخواندہ لوگ مقابل کی انا کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ سب مولوی

صاحب کا حق تھا۔

آج جمعرات تھی۔ بڑی بی نے نفٹ روزہ گوشت پکایا تھا۔ بلکہ کلثوم نے پکایا تھا۔ اس نوارو لڑکے نے اپنا نام ام کلثوم بتایا تھا لیکن اہل محلہ اسے صرف کلثوم کہتے تھے۔ بڑی بی کو کل رات سے بخار تھا لہذا وہ بڑی بی کی اجازت سے مولوی صاحب کے ہاں خود کھانا لے کر آئی تھی۔ اس نے بوسیدہ چوہی دروازے پر پڑی زنجیر ہلائی تو لمحاتی توقف کے بعد مولوی صاحب آ موجود ہوئے مگر ملگجی چادر میں لپٹی کلثوم کو دیکھ کر تھوڑا سا گھبرا اور دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔

جی بی بی فرمائیے۔ بلا کاشائستہ لہجہ تھا۔

کلثوم تو آخر کار لڑکی تھی، مردانہ حجاب پر لائی شرمندہ ہو گئی۔ کھانا لائی تھی مولوی صاحب آپ نے کیوں زحمت کی؟ امید ہے آئندہ آپ۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر رے تھامی اور دروازہ بند کر لیا۔ کلثوم اٹنے پاؤں واپس ہو گئی۔

مولوی صاحب کے بچے کچھے اہل خانہ کسی دور افتادہ گاؤں میں بستے تھے۔ کبھی کبھار ان کے بڑے بھائی اور بھابی آ جایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب اپنی سرکاری ملازمت کے باعث اس شہر کی اس کم مایہ کچی بستی میں رہنے پر مجبور تھے۔ ان کا اسکول بھی یہاں سے نزدیک تھا۔ وہ اس بستی میں اپنی رہائش پر مطمئن تھے۔ آج کل پھر ان کے بھائی، بھابی بطور مہمان ان کے ہاں آ ہوئے۔ اس مرتبہ مولوی صاحب کی بھابی، مولوی صاحب کی شادی پر سخت مصرتھیں کہ وہ اب ان کا نکاح پڑھوا کر ہی جائیں گی۔ اہل محلہ ان کے اس مشن پر مسرور تھے اور اپنی نیک

خواہشات کا اظہار کر رہے تھے۔

جب اہل محلہ نے بھاوج کی توجہ کلثوم کی سمت مبذول کر کر یہ بتایا کہ وہ رشتہ اپنے طور پر مولوی صاحب کے سامنے پیش کر چکے ہیں لیکن اس مرتبہ انہوں نے نکاح سے یہ کہہ کر معذوری ظاہر کی ہے کہ لڑکی بہت کم عمر ہے۔ مولوی صاحب کی بھاوج اللہ کی ایسی شاندار نعمت سے منہ موڑنے پر اپنا سر پیٹ کر رہ گئیں۔ اور نئے سرے سے ان کے پیچھے پڑ گئیں کہ لڑکی تو تمہارے ساتھ نکاح پڑھانے پر راضی ہے۔ اس پر کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے اور بالآخر انہوں نے اس مرتبہ یہ مہم سر کر لی۔

نکاح سادگی سے ہوا۔ چھوہارے اور شربت سے مہمانوں کی تواضع ہوئی اور مولوی صاحب کا مکان گھر بن گیا۔

اس دن کلثوم رو رو کر تین مرتبہ بیہوش ہوئی تھی۔ اس کا اس طرح بے حال ہونا سمجھ سے بالاتر تھا۔ روتے روتے اس نے کئی مرتبہ ذیاب بھی بکا تھا۔ عورتیں آخر کار یہی سمجھیں کہ اس اہم موقع پر اسے اپنے یاد آ رہے ہیں۔

اس کے حافضے میں گورے وقت کا لحد لحد روشن تھا۔ اسے یاد تھا کہ بچپن سے لے کر آج تک کبھی ایسی خوش بخت گھڑی نہیں آئی تھی، جس میں انہوں نے یعنی کلثوم کے بھائیوں نے اور استانی بی کے اکلوتے لیکن لپٹا لک بچے نے ایک دوسرے کو دوستانہ نظروں سے دیکھا ہو۔

اسے یاد تھا کہ جب اس کے بھائی زمانہ طفل میں تھے۔ اس لے پالک کے ساتھ یادگار

لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ یادگار اس لیے کہ ہر لڑائی کے بعد کسی نہ کسی کے وجود یا چہرے پر زخم کا نشان ضرور لگا تھا جس نے اس لڑائی کو یادگار بنا دیا تھا۔

اس زمانے میں وہ بہت ہی معصوم تھی، منصفانہ جس سے یکسر بے بہرہ لیکن جب ہوش کی دنیا اس پر روشن ہونا شروع ہوئی تو اسے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری پیش نہ آئی کہ دراصل اس کے بھائیوں کے وجود میں خود کی جگہ شرارت دوڑتی ہے اس لیے کہ وہ خود بھی بارہان کی شرارتوں کی زد میں آئی اور بری طرح آئی۔ اس کے بھائیوں کو خواہ مخواہ اس کی اکلوتی گڑیا سے بہت زیادہ چڑھتی۔ بیچاری کی ٹانگ توڑ کر جب تک اسے اپنا ج نہ بنا دیتے۔ انہیں چین ہی نہ آتا۔ کبھی وہ اس کے پسندیدہ کپڑے چھپا دیتے۔ اور کبھی آتے جاتے اس کے چنگی لینا بہت ضروری سمجھتے، اپنے بھائیوں کی ان حرکتوں سے وا اندازہ لگا چکی تھی کہ محلے بھر سے لڑائی کٹائی کی جو خبریں آتی ہیں، ان کا نقطہ آغاز اس کے دونوں بھائیوں کی؟؟؟؟ ہوتی ہے۔

اس نے بلا کی غیر جانبدار طبیعت پائی تھی؟؟؟؟ بھائیوں کی سرانگیزیوں اور سونے پر سہاگا، ماں کی حمایت ایسا آکھ نہ بھاتی تھی۔ مگر تب وہ بہت چھوٹی تھی کون اس کی سنتا؟ پہلی بار اس نے تب احتجاج کیا تھا جب اس کے بھائیوں نے اسے استانی جی کے ہاں سپارہ پڑھنے سے روکا اور ماں سے کہا کہ وہ اس کے لیے گھر پر ہی کسی قاریہ، قاری یا حافظ کا انتظام کر دیں گے۔ تب اسے بری طرح غصہ آ گیا تھا۔ استانی جی کا گھر کون سادہ ہے؟ دیوار سے دیوار ملی ہے اس کی ساری سہیلیاں وہیں قرآن مجید پڑھتی ہیں۔ گاہے گاہے اٹھ کر استانی جی کے کام کرتی ہیں اور

جان بوجھ کر دیر سے کرتی ہیں۔ ٹھنڈے لگاتی ہیں۔ گرمیوں میں استانی جی چھت پر کچے آم، ہلدی نمک لگا کر کھانے کو ڈالتی ہیں تو وہ کپڑے اتارنے کے بہانے اوپر جاتی اور دو چار ہلدی نمک لگی کچی بھانکیں، ہضم کرتی ہیں بعد کو استانی جی سوچتی رہ جاتی ہیں کہ اس مرتبہ دس سیر آم بہت ہی سوکھے گئے۔ پارسا بھی اتنے ہی آموں کا اچار ڈالا تھا مگر وہ تو اتنے نہیں سوکھے تھے۔ اب اس کے بھائی اس سے زندگی کی یہ خوبصورت رونق چھین لینا چاہتے ہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی تھی۔ بہت سی بیجا ضدیں بھی اسے جائز ہو جاتی تھیں۔ لہذا اس نے اعلان کر دیا کہ وہ قرآن پڑھے گی تو صرف استانی جی سے ورنہ کسی سے نہیں پڑھے گی۔

ماں کے سمجھانے پر بھائی رضا مند تو ہو گئے، مگر اسے گھورا بہت تھا۔ تب اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے منہ بسور کر کہا تھا۔

امی آصف بھائی اور چھوٹے بھائی، انعام بھائی سے لڑتے ہیں، میں تو نہیں لڑتی۔ پھر میں کیوں استانی جی کے ہاں نہ جاؤں؟

نہیں نہیں بیٹی تمہیں کیوں منع کریں گے استانی جی کے ہاں جانے سے، وہ تو بہت اچھی اور مہربان عورت ہیں۔ پھر میری بیٹی سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آصف، ماجد تو پاگل ہیں، زمانے بھر کے شرارتی۔ ماں کے خیالات سے اسے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا۔ اس کا استانی جی کے ہاں بیخوف و خطر جانا آنا بدستور رہا۔ ہاں تک کہ تیسوں پارے عمر کی گیارہ منزلوں تک آتے آتے اس نے پڑھ ڈالے۔

انعام اللہ یہ نام استانی نے اپنے اس لیپا لک بیٹے کا چاہتوں کے ساتھ رکھا تھا۔ بیوگی کی تازہ فصل پر عمر کی درانتی چلا رہی تھیں کہ کسی دور پار کے عزیز نے انہیں اللہ کا یہ انعام پہنچایا تھا۔ انعام اللہ دو ماہ کا تھا۔ جب استانی جی کے بازوؤں میں آیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی پسند سے یہ نام رکھا تھا۔ سنا تھا کہ بچے کی ماں زوجگی کے چند گھنٹے بعد ہی اسے تنہا چھوڑ گئی تھی مگر استانی جی نے اسے بہت پیار سے پالا تھا۔ بچپن کے برعکس جب وہ آصف اور ماجد کے ساتھ برسرِ پیکار رہتا تھا۔ براہِ مکر وہ بہت سلجھا ہوا نکلا تھا۔ بہت کم لوگ یہ بات جانتے تھے۔ کہ وہ جارح نہیں تھا۔ اس کی جنگ ہمیشہ دفاعی ہوتی تھی۔ بغیر تی و تبحر اس کی مٹی میں نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے ظلم سہنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ اس کا ڈیل ڈول آصف و ماجد دونوں سے مضبوط اور نکلتا ہوا تھا۔

متوسط طبقے کی اس کالونی میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ بستے تھے سب ایک دوسرے کیدوست تھے۔ علاوہ ان تینوں کے، یہ آج بھی ایک دوسرے کے خون کے پیارے تھے۔ ان کے سینوں میں انتقام کے لاؤڈ ہکے رہتے تھے۔

اسکول ایک رہا جہاں سے کئی بار معرکہ رپوٹ گھر آئی۔ پھر ان کا کالج ایک رہا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہاں قائم، پارٹی بازی سے ان کے چوہا رہ الگ ہو گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کی حریف مخالف پارٹی سے تعلق قائم کیا۔

ان کی دشمنی دیکھ کر اس کے اعصاب شل ہو جاتے اور دل وحشت زدہ، پھر کالج میں پکڑے

جانے والے لڑکوں میں آصف کا نام بھی دیکھا گیا تو گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ باپ بیچارہ کہاں کہاں خوار نہ ہوا۔ آصف دو دن سرکاری مہمان کیا بنا کہ اس کے تو اطوار ہی بدل گئے۔ اب تو اسے یہ ناز بھی تھا کہ وہ جوالات کی ہوا کھا کر آچکا ہے۔ آخر پٹھان خون ہے کسی بزدل کا نہیں۔

وہ استانی جی کے ہاں کم جاتی تھی اور انعام سے سامنا بھی کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ مگر وہ اس پر بھی اچنتی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کم رو تھی بلکہ اس لیے کہ قرآن پڑھنے کے لیے آنے والے بچوں کے شور سے وہ بہت گھبراتا تھا اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی وقت گزارتا تھا۔ ایک روز جب وہ کالج سے تھکا ہارا گھر آیا تو قاری بچوں کے ہتھ تپ جو توں، چپلوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچا اور بھٹا کر رہ گیا۔

اماں جان کم از کم ان بچوں کو جوتے اتارنے اور رکھنے کی تمیز تو سکھا دیں۔

جوتے ہمیشہ اسی جگہ پا جاتے ہیں اور اسی انداز میں۔ یہ خیال آپ کو پہلے کیوں نہیں آیا کہ بچوں نے تمیز سکھانا چاہیے؟ وہ اسے گرتے گرتے سنبھلتا دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھی تھی۔

انعام نے چونک کر اس شرانگیز آواز کی سمت دیکھا۔

تسلیم وہ بولی۔

اس نے غور سے دیکھا جو واقعی سرتاپا تسلیم و نیاز نظر آ رہی تھی۔

اے ہاں یہ تسلیم ہی تو ہے، بڑی سمندر پار سے آئی ہے جو پہچانی نہیں جا رہی۔ ارے یہ تو بہت

چھوٹی سی تھی تب سے آ رہی ہے؟

ماں کے ان جملوں پر اس نے بغور اس کے نیاز حاصل کیے۔ دراصل جب سے اس نے قرآن مجید ختم کیا تھا۔ اس کا استانی جی کے ہاں کم ہی آنا ہوتا تھا۔ وہ بھی بہ مشکل کسی بہانے سے، جیسے آج آگئی تھی۔ کوفتوں کا، ہدیہ لے کر، اور جب وہ آتی تھی تو انعام اسکمل، کالج یا میچ وغیرہ کھیلنے گھر سے باہر ہوتا تھا۔

یہ عجیب لیکن اچھی بات تھی کہ بچوں کی اکثر اوقات کی چمٹک کے باوجود دونوں گھروں کے بڑوں کا رویہ ایک دوسرے کے ساتھ نارمل تھا، جس پر دونوں طرف کے بچے اپنے بڑوں سے نالاں تھے۔ اور چاہتے تھے کہ دونوں گھرانے آپس میں عام سی صاحب سلامت بھی نہ رکھیں۔ انعام، اسے واقعی اللہ کا انعام لگا تھا۔ وہ جو مہینے بھر تک استانی جی کے دروازے کو دور سے ٹکا کرتی تھی، اکثر استانی جی کے کام کرتی نظر آئے گی۔ میٹرک کے امتحانات کے بعد فراغت تھی۔ عمو اپنی سلائی کڑھائی کا سامان لے کر ان کے ہاں آ جاتی اسے خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ کیا اسے کچھ اچھا لگا ہے؟ اور بات یہ ہے کہ جو شے اچھی لگتی ہے، بغیر دلیل کے لگتی ہے۔ اچھے لگنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ پہلے چیز بے ساختہ اچھی لگتی ہے پھر انسان اپنے دل سے دلیل طلب کرتا ہے کہ یہ اسے کیوں پسند آئی؟ اور دل، دلیل کا گھر نہیں ہے۔ دلیل کا ٹھکانہ عقل ہے جو کب کی منہ بسور کر، کواڑ پھیر کر بیٹھ چکی ہوتی ہے لہذا وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ ادھر وہ بھی انجان نہیں تھا۔ محتاط تھا۔ پارسا تھا اپنے وقار کے لیے بے پناہ حساس تھا۔

اس لیے خاموش تھا۔

نئے سال کے چند ماہ گزرے تھے کہ قدرت نے تسلیم کو قیمتی کا امتحان اور بھائیوں کی حاکمیت کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ اس کے سر سے مضبوط سائبان ہٹ گیا تھا۔ جب ماں ہی ٹوٹی ہوئی نظر آئی تو اس کا کیا سوال۔ وہ تو محض اپنے وجود ہی میں قید ہو کر رہ گئی۔ دل کے چور نے علیحدہ اس کی مشکلیں کس دی تھیں۔ اسے بھائیوں کی خونخوار اور سخت نظریں اپنا آپ پڑھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

اور جب وہ ایک عرصے بعد مرحوم کی عزت کا ادراک کر کے استانی جی کے گھر آئی تو وہ اسے سامنے ہی مل گیا۔ بیٹھا جوتوں کے پسمے کس رہا تھا۔ صحن میں بچوں کا مخصوص شور تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔ کہاں تھیں؟

سماری اولوالعزمی یہاں وہاں کہیں بہہ گئی اور اس نے سوچا وہاں جہاں تم آج تک نہیں پہنچے۔ گویا وہ اس کی آمد کو محسوس کرتا رہا ہے، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اس پر ایک اچنتی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مگر اس کے چہرے پر بڑا حوصلہ افزا اثر تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک بار اس نے اتفاق سے ماں کی وہ بات سن لی تھی۔ وہ اس کے بھائیوں سے کہہ رہی تھیں۔ استانی جی تسلیم کو بہت زیادہ پسند کرتی ہیں۔ کئی بار اشارتا کہہ چکی ہیں کہ وہ اسے اپنی بیٹی بنانا چاہیں گی۔

اوقات دیکھی ہے بڑھیا نے؟ اور کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس کے اس زبردستی کے بیٹے میں؟ آصف کا طرزِ مخاطب اس گھر کے ذکر پر پستیوں کی انتہا کو جانپنا تھا۔

اور اگر اس طرم خان نے ایسا سوچا ہوگا تو جان سے مار کر چوک پر لٹکا دوں گا۔ ماجد بولا۔

اس قدر آپ سے نکلنے کی کون سی بات ہے؟ ماں نے جھڑک دیا۔ ایک بات ہو رہی تھی۔ آج بھی کل کے ننھے بچے بنے ہو ہیں۔ توبہ ہے۔ ماں نے مزید لعن طعن جاری رکھی تو وہ ایک ننھے کرب سے آشنا ہو گئی ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت نہ ہو اور احساسِ بپسی کی انتہا ہو تو خواہش جنون بھی بن جاتی ہے۔ پابندی ازل سے حوالہ آدم کے تجسس اور شوق کو بھڑکاتی آئی ہے۔ اسے خونی رشتے سانپ بن کر ڈسنے لگے تھے۔

تسلیم اب بھی آنکھ بچا کر وہاں ہوا آتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح انجان بن کر ہی ملا۔ جوت جلی اور بجھ بھی گئی۔ تھوڑی سی توجہ کے بعد شدید بے توجہی سے قراری لٹ گیا۔

ایک روز جب استانی جی بچار میں پھنک رہی تھیں اور تسلیم برف کی پٹیاں ان کی پیشانی پر رکھ کر ان کے وجود کی آنچ کم ہو رہی تھی کہ وہ بہت پریشان و بیقرار نظر آیا اور اسے اشارے سیاہر بلایا۔ تسلیم ہمتے دل کو سنبھالتی جب اس کی بات سننے باہر آئی تو وہ بیدھڑک بولا۔

تسلیم میرا انجان بننا بھی کسی کام نہیں آیا۔ تم بالکل نہیں بدلیں۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ سب ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن، براہ مہربانی تم میرے گھر نہ آیا کرو۔ میں امتحان میں پڑ جاتا ہوں۔

تسلیم نے کانپتا دل سنبھالا، اس کی سمت دیکھا اور سوچا، غافل تجھے اتنی دیر میں سوچھی۔ پھر وہ

بولنے کی کوشش کرتی رہی مگر آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھا اور لفظ اس کے ہونٹوں پر نہ اتر سکے بالآخر وہ بولا۔

آخر ہم کرب بھی کیا سکتے ہیں؟ یا تو یہ کہ کورٹ میرج کر لیں اور بدع میں اعلان کر دیں پھر کیا کر سکیں گے تمہارے بھائی؟ مگر مجھے لگتا ہے پھر بھی تم ہارو گی، اس لیے کہ وہ جلد ہی تمہیں بیوہ کر دیں گے۔ اسے بھی اس کے بھائیوں ہی سے خطرہ تھا۔

کورٹ میرج۔ میرج سے لجانے والی کورٹ میرج کی بات سن کر چکر اسی گئی۔ نن، نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ واپس استانی جی کے کمرے میں آ گئی اور ان کے سر ہانے کھڑی ہو گئی۔ منزل کس قدر قریب تھی اور کس قدر دور بھی۔ پھر وہ بری طرح الجھ کر گھر آ گئی تھی۔

انعام اللہ کو گرجویشن کے بعد محکمہ جنگلات میں مروے آفسر کی جابل گئی تھی۔ اب اسے کسی دوسرے شہر جانا تھا۔ استانی جی اس کے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔ ناچار ہو بھی اس کے ہمراہ جاری تھیں۔ محلے کی تین نسلوں نے جدائی کے لمحوں کے کرب سمیٹے تسلیم سکتے کے عالم میں خالی الذہن رہ گئی۔ کس قدر بیدرد تھا وہ گئی تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماہی بے آب کی طرح پڑت کر اس نے وداع کے لمحوں کا سامنا کیا اور چلا گیا۔ وہ محض سوچتی رہ گئی کہ اب وہ کیسے رہے گی؟ کیوں کر جیے گی؟ اسے اپنے بھائیوں کی صورت سے وحشت ہونے لگی۔ عورتیں اکثر اس کی ماں کے پاس بیٹھ کر استانی جی کو یاد کیا کرتیں مگر تسلیم صرف اسے، اگر وہ مہندی رنگے بالوں والی خوبصورت بوڑھی عورت کبھی یاد بھی آئی تو اس کے حوالے

ہے۔ سرکتے دنوں نے اچانک اسے تجھے کی صورت اس کی آمد کی اطلاع دے کر کروٹ بدلی۔ پتا چلا، کچھ ضروری سامان لینے آیا ہے جو گھر میں رہ یا تھا۔ وہ دو دن کے لیے آیا تھا۔ پورا محلہ اسے گھیرے بیٹھا تھا۔ سب اس سے اپنی استانی جی کے بابت پوچھ رہے تھے۔ مگر اس کے بھائی حسب سابق جل بھن کر خاک ہو رہیتھے۔ آخر رات کو اس نے انعام اللہ کا دروازہ بجایا۔ وہ اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر مسکرا دیا۔

کسی نے دیکھا تو نہیں؟

نہیں وہ تیزی سے اندر آ گئی۔

مجھے اپنی فکر نہیں ہے، صرف تمہاری ہے۔ تمہارے بھائی۔

مت کروان کا ذکر انہوں نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کیا ہے۔

ان کی کیا مجال؟ اگر انسان خود ہی نہ چاہے تو؟ وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ کیا پھر دور ہونے کے لیے؟

استانی جی کیا کہیں گی؟ آخر کار اس نے کہا۔

انہیں تمام صورتحال کا علم ہے۔

اگلے روز بلکہ اگلی شب وہ ٹرین کے سیلپر میں بیٹھے، آئندہ پیش آنے والے مراحل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ حیدر آباد اسٹیشن پر وہ پسلیم کو چا دے کر جو اس نے چھوٹے سے تھرماس میں بھری تھی۔ کچھ چیزیں لینے کے لئے نیچے اتر گیا تھا۔ چا کے آخری گھونٹ نے تسلیم پر

غنودگی طاری کر دی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ تیز چمکتی دھوپ کھڑکی کے راستے اندر آ رہی تھی۔ گاڑی جانے کن بیابانوں کا سینہ چیرتی گزر رہی تھی۔

دور دور تک ویرانی پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دل گویا پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔ اس کے حواس کام کرنا جھوڑ گئے تھے۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہے۔

ٹرین کی رفتار کا شور اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر لگ رہا تھا۔ اور ہر ضرب کے ساتھ ایک نیا سوال گونجنے لگتا تھا۔

وہ کہاں ہے؟

وہ کہاں گیا؟

کیا میں اتنی دین سوچتی رہی؟

وہ بمشکل اٹھ کر ہاتھ روم تک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اسے چکر آ گیا۔ انعام اللہ اس نے یوں آہستہ کیے سے پکارا، گویا وہ اس کے دل میں ہو، اور جیسے پکار کا جواب دے گا۔

یہ کیا ہے انعام اللہ

معا سے اپنا پنڈ بیگ یاد آیا جس میں خاصی رقم اور سونے کے دو تین زیور تھے۔ اس نے تیزی سے چادر سیٹ سے کھینچ کر ایک طرف کی۔ پنڈ بیگ موجود تھا۔ اس نے جلدی سے کھول کر اپنی چیزیں دیکھیں۔ رقم بھی موجود بھی اور زیور بھی ان کے علاوہ خاکی کا غذا کا لفافہ بھی تھا۔ اس نے فوراً کھول کر دیکھا۔ ایک سفید تہہ شدہ خط میں سو سو کے چار نوٹ رکھے تھے۔ وہ جو اس تمام

صورتحال سے انتہائی دلبرداشتہ نظر آرہی تھی، ایک دم مستعدی ہوگئی، اور خط پڑھنے لگی۔
تسلیم صاحبہ

گاڑی حیدر آباد کے اسٹیشن پر کافی دیر کتی ہے۔ میں یہاں تمہارے سامنے اتروں گا اور دوسری گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم نے چاہی؟ ذائقہ کیسا لگا؟ یقیناً تمہیں آٹھ گھنٹے کے اندر ہوش آ گیا ہوگا۔ تم دوسری گاڑی سیکھر واپس چلی جانا میں بس اتنا چاہتا تھا کہ تمہارے بھائی کی گالی کا جواب، تمہارے ذریعے دوں۔ تین سال قبل تمہارے بھائی نے کالج میں بیسیوں لڑکوں کی موجودگی میں مجھ سے کہا تھا۔

نہ جانے کس گندی عورت کا انعام ہے جسے استانی جی نے ترس کھا کر پالا ہے۔ اسے تو اپنے باپ کا نام بھی نہیں معلوم۔

میری حقیقت کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن تمہارے بھائی نے مجھ سے سنا کر چلنے سے روکا تھا۔ بات ہے غیرت کی۔ اگر مجھے گالی سننا آتا ہے تو اسے لوٹانا بھی آتا ہے۔

تم اذیت ضرور اٹھاؤ گی مگر تمہاری ماں زندہ ہے وہ تمہیں مرنے نہیں دے گی کہ تم اس کی اکلوتی بیٹی ہو۔ میں نے تمہارے بھائیوں سے انتقام نہیں لیا۔ بلکہ ان کو اپنے برابر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ سب نہ ہو پاتا اگر تمہاری نظر مہربان نہ ہوتی۔ بہت شکریہ۔

تمہارا اور میرا ایک گلی سے ایک رات اکٹھے غائب رہنا۔ یہی تمہارے بھائیوں کو جواب ہے، ہو سکے تو یہ خط بھی اپنے بھائیوں کو دکھا دینا۔ واپسی کے اخراجات کے لیے کچھ رقم رکھ دی ہے۔

انعام اللہ

محبت کی یہ صورت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی۔ ماں زندہ ہے مگر معزول ملکہ ہے۔ یہ تم نے کیا کیا انعام اللہ؟ اس نے سوچا اتنی بھگدڑ مچی ہوگی۔ ایک زمانہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوگ۔ اس کے بھائی اس کا قیمہ کرنے کو بیتاب کھڑے ہوں گے۔ صرف اس کا ہی نہیں بلکہ انعام اللہ کا بھی۔ یہ سکایا ہو گیا۔ یہ تم نے کیا کر ڈالا انعام؟ کیسے مردہ تو مت انتہائی پارسا کہ مجھے کبھی چھو ای نہیں اور انتہائی۔۔۔ رذیل بھی کہ مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔

اس کی ماں نے اسے بچپن میں ایک کہانی سنائی تھی، جس میں ایک خوفناک اژدھے کا ذکر تھا۔ اس اژدھے کی پھنکاریں اتنی طاقتور تھیں کہ ہزاروں گو کے فاصلے پر کھڑے شخص کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھیں۔ وہ پھنکاریں شاید کسی کینہ پرور کے انتقام کا بھیس ہوں گی۔ جھلسا کر رکھ دینے والے منتقم کا بھیس جو اژدھے کے وجود کو کمین گاہ بنا ہوتے۔

میری خطا کیا تھی انعام؟ محض آصف کی بہن ہونا میرا سب سے بڑا جرم ٹھہرا۔ اس نے خود کلامی کی پھر اس کی تمام حسیں جاگ اٹھیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اتنی شدت سے کہ اس پر نا توانی طاری ہوگئی تھی۔

جہاں گاڑی خالی ہوگئی، وہ بھی اتر گئی۔ اس کا سب کچھ سلامت تھا پھر بھی وہ سر تا پا لٹ چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کراچی جانے والی ایک ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اس کی قوت فیصلہ اب بھی مفلوج تھی۔

کھانے کو بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔

انہیں دنوں بستی میں ایک سانحہ ہو گیا۔ بہن حلوائی کی بیٹی رشیدہ کرم دین رکشاؤ رانیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس کی ماں مولوی صاحب کے پاس اس کی واپسی کے لئے دعا کرانے آئی۔ ام کلثوم نے اس میں اپنی ماں کی تصویر دیکھی تو دل کانپ کر رہ گیا۔

آخر کار بستی والوں کی بھاگ دوڑ کام آئی رشیدہ اور کرم دین باز یاب ہو گئے۔ باہمی مشورے سے دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ اور ساتھ ہی رشیدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ آج سے اس کا کوئی میکا نہیں۔

یہ سب باتیں کلثوم کے زہموں پر نمک پاشی کا کام کر گئیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشیدہ سے ہمدردی کر بیٹھی۔ اپنائیت کے احساس سے اس راند ہند رگاہ کا دل بڑھاتی۔ اس کے کام آتی جس پر بستی والوں کو بھی اعتراض تھا۔ مگر مولوی صاحب کے احترام کی وجہ سے وہ منہ سے کچھ نہ کہتے۔

آج جمعرات تھی۔ رشیدہ منت کی کھیر اس غمگسار کے ہاں لائی تھی جو اس نے مولوی صاحب کو کھانے کے ہمراہ پیش کر دی کیونکہ وہ بیٹھے کے بہت شوقین تھے، کھانے کے بعد جب وہ کھیر کھانے لگے تو ایک لمحے کے لیے رک گئے۔

یہ کھیر کس کے گھر سے آئی ہے کلثوم؟

رشیدہ لے کر آئی تھی۔ وہ آہستگی سے بولی۔

اس کا ذہن بس ایک خیال پر دستک دیے جا رہا تھا کہ کسی اور کا ڈھکے پر ٹھہرا ہوا یا نہ ٹھہرا ہو مگر اس کے گھر والے سیکنڈ کے ہزارویں حطے میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے ہوں گے کہ وہ انعام کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ کیوں کر یقین دلا پا گی کہ اس کا کچھ۔

جب وہ کراچی کینٹ پر پینڈ بیگ سنبھال کر اتری تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ خیالات کی یلغار اب اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ وہ کیوں اور کس منہ سے اس گھر میں جا جس کا ایک ایک چراغ چکنا چور کرنے کے بعد وہ تاریکی اوڑھ لپیٹ کر باہر نکلی تھی۔ اس نے خشم تصور سے اپنے گھر کی دہلیز پر اپنے وجود کے ٹکڑے خون میں لت پت بکھرے دیکھے کہ اس کے ذہن کو اپنے غیرت مند بھائیوں کے مزاج کا ادراک تھا۔ پھر اس نے اپنے بھائیوں کے خون آلود ہاتھ تھکڑیوں سے بو جھل دیکھے، انہیں قید با مشقت کا نئے ان کی سفید داڑھیوں کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ اور اسی لمحے اس نے خود اپنی زندگی پر فاتحہ پڑھ لی، سوچ اور سفر دونوں کا رخ بدل دیا اور کچی بستی میں چلی آ۔ جو بہت ہی پس ماندہ دور افتادہ تھی، وہ جانتی تھی کہ اسے ہر جگہ ڈھونڈا جا گا حتیٰ کہ بے سہارا عورتوں کے مراکز تک میں بھی۔ تسلیم کو اس نے کراچی کینٹ میں دفن کر دیا۔ اور آج وہ ام کلثوم بنی مولوی صاحب کی منکوحہ تھی۔

مولوی صاحب اس بے سہارا، خوبصورت، خوش اطوار بیوی کے بڑے قدر دان تھے، ہمہ وقت اس کی دلجوئی کرتے رہتے خاص طور پر انہیں اس کے ہاتھ کے کھانے بہت پسند تھے۔ وہ اسے بتاتے کہ وہ کہیں بھی کھانا نہیں کھاتے، خواہ کوئی کتنا ہی مجبور کرے کہ وہ اس کے ہاتھ کے پکے

لاحول والاقوة انہوں نے پیالہ رکھ دیا۔ میں کسی بھگوڑی کے ہاتھ کا پکا کھانا کھانا کفر سمجھتا ہوں۔
نہ جانے کلثوم کا کلیجہ کیوں کانپا تھا بھائی عقب سے نشانہ باندھے ہوئے تھے، کوئی بات نہیں لیکن
مولوی صاحب کے تیر کا رخ اس کے دل کی سمت تھا۔ کھیر کا پیالہ اٹھا کر کمرے میں چلی آئی
تاکہ مولوی صاحب اس کی پلکوں پر لرز نے والے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

اختتام ----- The End